بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوچا کرو

قرآن کریم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس نے وسیع و عریض کارگہ کائنات کے حقائق اور نفس انسانی کے عمیق و دقیق رموز و اسرار' ایسے **مرتکز** (Concentrated) انداز سے بیان کئے ہیں کہ اس کے ایک ایک قطرے میں سمندر سمویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے جامع صحیفہ کائنات' اور مکمل ضابطہ حیات کی ضخامت اتنی مختصر ہے کہ اگر اسے انگریزی زبان کے باریک ٹائپ میں چھاپا جائے تو چند اوراق میں قلمبند ہو جائے۔ اس کے تحیر انگیز ارتکاز کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

حضور نبی اکرمؐ نے عمر بھر' قرآن کریم کی انسانیت ساز تعلیم' قریش کے سامنے پیش کی اور انہوں نے اس کی جی بھر کے مخالفت کی۔ آخر الامر' آپؐ نے ان سے ایک دن کہا کہ میں عمر بھر تم سے تفصیلی گفتگوئیں کرتا رہا ہوں' لیکن آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ...... اے رسول! ان سے کہو کہ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

انہوں نے جی میں کہا کہ یہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہے اس کے سن لینے میں کیا حرج ہے؟

انہیں اس طرح آمادہ پا کر آپؐ نے فرمایا کہ وہ بات ایسی معمولی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اس لئے اسے کھڑے ہو کر دل کے کانوں سے سنو۔۔۔ سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔۔ **اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى** ..... جب آپؐ نے انہیں اس طرح نفسیاتی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا تو فرمایا کہ میں جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں' وہ یہ

ہے کہ

ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا .....(34/46)

تم، سوچا کرو۔

اس ایک لفظ میں، قرآن کریم نے حقائق و رموز انسانی کی کتنی دنیائیں سمٹا کر رکھ دی ہیں، اس کا صحیح اندازہ وہی قومیں لگا سکتی ہیں جو عقل و فکر کی اہمیت سے واقف ہیں۔ ہمارے لئے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ سارا قرآن، عقل و فکر اور غور و تدبر کی تاکید سے بھرا پڑا ہے، حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ انسان نہیں، حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔ (7/179) یہ اہل جہنم میں سے ہیں۔ (7/179)

قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، وہ انسان نہیں، بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں، نہ صرف فکر انسانی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کی تخلیقی تاریخ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ قرآنی حقائق (اور عصر حاضر کے سائنٹفک انکشافات) کی رو سے، زندگی (کسی خاص فرد یا نوع کی زندگی نہیں، بلکہ خود زندگی) اولیں جرثومہ حیات کے نقطہ آغاز سے، اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، پیکر انسانی تک، پہنچی ہے۔ اس کے اس سفر میں دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، یعنی :۔

تکرار ہی تکرار

1۔ جس نوع نے جس مقام پر کش مکش حیات سے منہ موڑ لیا، وہ اسی مقام پر رک کر رہ گئی۔ آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کا مقصد حیات اپنے آپ کو دھرائے چلے جانا (Repition) یا (Reproduction) رہ گیا۔ لاکھوں، کروڑوں سال سے چھپکلی اپنے جیسی چھپکلیاں پیدا کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ بکری، اپنے جیسی بکری ہی پیدا کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر، جب کوئی نوع ایک مقام پر رک جاتی

ہے تو اس کی زندگی کی حرکت' دوری (Cyclic) رہ جاتی ہے' ارتقائی یا صراطی (Evolutionary) نہیں رہتی۔ اور

2۔ ہر نوع جو آگے بڑھتی ہے اس میں' سابقہ نوع کے مقابلہ میں' دماغی استعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ جب کوئی نوع کسی مقام پر رک جاتی ہے تو اس کی "ذہنی استعداد" بھی وہیں منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

زندگی جب انسانی پیکر میں پہنچی تو اس کی "ذہنی استعداد" کو فکر سے تعبیر کیا گیا۔ فکری صلاحیت' خاصہ انسانیت ہے۔ حیوان اس سے محروم ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فکری صلاحیتوں کو کام میں نہ لانے والے انسانوں کو **أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ** ....(7/179) کہہ کر پکارا ہے یعنی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے' بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ' کیونکہ حیوانات (کم از کم) اپنی حیوانی صلاحیتوں (Instinct) سے تو کام لیتے ہیں!

فکری ارتقاء

سطح بیں لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر نظریہ ارتقاء صحیح ہے تو انسان کسی دور نوع میں تبدیل کیوں نہیں ہو گیا؟ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اب ارتقاء جسموں اور پیکروں کے تغیر و تبدل کی شکل میں نمودار نہیں ہوتا۔ منزل انسانیت میں پہنچ کر' فکری ارتقاء کا آغاز ہوا ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا لاکھوں سال پہلے کا غاروں میں بسنے والا انسان' اور چاند ستاروں کو مسخر کرنے والا آج کا انسان' فکری طور پر ایک ہی نوع کے افراد ہیں ؟ آج کا انسان' غاروں میں بسنے والے انسان سے یقیناً" ایک مختلف " نوع " کا انسان ہے۔

وحی کا مقصد' انسانی فکر کو جلا دے کر' اس کی آماجگاہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا ہے۔ جہاں تک فکری جلا کا تعلق ہے' قرآن کریم شروع سے آخر تک' غور و تدبر پر زور دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○ (47/24)

یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے دلوں نے اپنے اوپر' خود وضع کردہ تالے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کے اندر کچھ داخل ہی نہ ہو سکے۔

وہ ان لوگوں کو مومن ہی تسلیم نہیں کرتا جو عقل و فکر سے کام لئے بغیر' کسی بات کو یونہی سچا مان لیں۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ○ (25/73)

یہ وہ لوگ ہیں کہ' اور تو اور' جب ان کے سامنے آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں' تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل و فکر کو بالائے طاق رکھ کر' اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر گر پڑیں۔ وہ انہیں علم و بصیرت کی رو سے تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں تک انسانی فکر کے میدان کی توسیع کا تعلق ہے' وہ کہتا ہے کہ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ○ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ...... (2/219)

اس طرح اللہ تعالیٰ حقائق کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت' دونوں کی زندگی پر غور و فکر کر سکو۔

انسان کو فکری صلاحیت عطا کر کے' اسے حیوانات سے ممتاز کر دیا۔ اور اخروی زندگی کو فکر کے دائرے میں شامل کر کے' مومن اور کافر میں امتیاز کر دیا۔ لہٰذا الدین (اسلام) نام ہے' دنیا اور آخرت کی زندگی میں غور و فکر سے کام لینے کا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلسلہ ارتقاء کی رو سے' انسان کی فکری صلاحیت بڑھتی اور بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے کسی ایک دور (زمانہ) کی فکری سطح حرف آخر نہیں قرار پا سکتی۔

دین یہ کچھ کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب' کسی ایک زمانہ کی فکری سطح کو حرف آخر قرار دے کر' اسے وہیں منجمد کر دیتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی' حیوانی سطح (کالانعام) پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا مقصد (آگے بڑھنے کے بجائے) تکرار (Repitition) رہ جاتا ہے یعنی جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اسے ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے کر' اس کی ہو بہو نقل کرتے رہنے کو مقصد حیات سمجھ لینا۔ اسے مذہب کی اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔ قلادہ اس رسی یا طوق کو کہتے ہیں جسے مویشیوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے' اور اس سے مویشی کو جدھر جی چاہے چلایا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ معانی کے اعتبار سے بھی تقلید سے انسان کی پوزیشن کیا ہو جاتی ہے۔ چونکہ تقلید (مذہب) کا مدار عقل و فکر پر ہوتا ہی نہیں' اس لئے اس میں سوچ کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی فکر اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ وہ اتنے زمانے بعد کی فکر کو دلائل سے مطمئن کر سکے۔ بجائے اس کے کہ مذہب اس حقیقت کا اعتراف کرے' وہ سرے سے غور و فکر ہی کو حرام قرار دے دیتا ہے۔ اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے مسلک کو " الحاد و بے دینی " کے حملوں سے محفوظ کر لیا ہے۔ اگر کہیں سے دلیل طلبی کی آواز اٹھتی ہے تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر مشتعل کر دیتا ہے کہ یہ شخص تمہارے سلف صالحین اور ائمہ مقدسین کے مسلک کو جھوٹا کہتا ہے۔ عوام پر عقل و فکر کے دروازے پہلے ہی بند ہوتے ہیں جب ان کے جذبات کو بھڑکا دیا جائے تو ان کے آتش فشاں کا لاوا ابل پڑتا ہے۔۔۔ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک حادثہ وہ ہوتا ہے جب جہالت' میدان عمل میں اتر آئے!

مذہب' اس قسم کے وقتی ہنگامے تو برپا کرا سکتا ہے' دوام اس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ مذہب پرست قومیں' اہل فکر و عمل قوموں سے کوسوں پیچھے ہوتی ہیں۔ وہ قومیں' ہر آن آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن مذہب پرست قوم اپنے مقام پر کھڑی' عمودی حرکت میں مصروف رہتی ہے اور اس سعی لا حاصل سے تھک کر'

مرور زمانہ کے ہاتھوں' غبار کارواں کی طرح' خاک نشین ہو جاتی ہے' اور۔۔۔۔ قرآن کے الفاظ میں' نہ آسمان ان کے غم میں روتا ہے' نہ زمین ان کی موت پر آنسو بہاتی ہے۔۔(44/29)

کائنات میں تفکر

پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ " دنیا اور آخرت میں فکر کیا کرو۔ " دنیا سے مراد خارجی کائنات ہے۔ اس کے متعلق اس نے کہا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (45/13)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سماوات) میں جو کچھ ہے' خدا نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں (حقیقت تک پہنچنے کی) بہت بڑی نشانیاں ہیں۔

کائنات میں قوانین فطرت کار فرما ہیں' جو اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ قوانین انسانی فکر کے وضع کردہ نہیں (خدا کے متعین کردہ ہیں) لیکن انسانی فکر انہیں دریافت کر سکتی ہے۔ اس کے بعد' ان قوانین کی رو سے' فطرت کی مخفی قوتوں کو منکشف کیا جا سکتا اور انہیں اپنے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ انسانی فکر جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے' تسخیر فطرت کے نت نئے گوشے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب مذہب' انسانی فکر کو ماضی کی کسی منزل میں ساکن اور منجمد کر دیتا ہے' تو فطرت کے متعلق جو کچھ اس وقت تک معلوم ہو چکا ہوتا ہے (یا جو نظریات اس وقت قائم ہوتے ہیں) ان کا علم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اگر کوئی مفکر یا **سائنسدان**' تازہ فکر کی رو سے کوئی نیا انکشاف کرتا ہے' تو مذہب یہ کہہ کر اس کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے کہ یہ نظریہ اسلاف کے مسلک کے خلاف' لہٰذا الحاد اور بے دینی ہے۔ یورپ (عیسائیت) کی سولھویں' سترھویں صدی سے پیشتر

کی تاریخ اس " معرکہ' مذہب اور سائنس " کی تاریخ ہے۔ اس میں' گیلیلیو یا **کوپرنیکس**' جیسے سائنس دانوں کو اس جرم کی پاداش میں مستحق دار و رسن قرار دیا گیا تھا کہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ زمین گول ہے یا گردش کرتی ہے۔ اقوام مغرب نے تنگ آ کر' آخر مذہب کا لبادہ اتار کر پھینکا تو آج چاند تک کو اپنے زیر قدم لانے کے قابل ہو گئیں۔ ان کا پادری تو آج بھی یہ کہتا ہے کہ کائنات' فلاں سن' فلاں مہینے اور فلاں دن کو وجود میں آئی تھی' لیکن اس کی اس آواز کو گرجا کی چار دیواری سے باہر' درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

اقدار حیات

لیکن چونکہ وہ قوتیں " آخرت کی زندگی " (خدا کے قانون مکافات یا اقدار خداوندی) کی قائل نہیں' اس لئے وہ جوں جوں' فطرت کی قوتوں کی تسخیر میں آگے بڑھتی جاتی ہیں' باہمی تصادمات سے' انسانی دنیا کو جہنم زار بنائے چلی جا رہی ہیں' جس میں وہ خود بھی جلتی ہیں اور باقی انسانیت کو بھی جلاتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ہے :

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار
عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا !
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا !
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

(یہاں' عشق اور فرمان نظر سے مراد' اقدار حیات اور ان کی صداقت پر یقین ہے)۔

قرآن نے " دنیا اور آخرت " دونوں کو فکر کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔
" دنیاوی فکر " سے مراد وہ تمام علوم سائنس ہیں جن کی تحصیل کے لئے اقوام مغرب

کی (مذہب کی گرفت سے آزاد شدہ) فکر اس قدر مصروف سعی و کاوش ہے۔ قرآن کریم نے (چھٹی صدی عیسوی میں) ان علوم کی تحصیل کو مومن کی زندگی کا شعار بتایا تھا۔ اس کی تائید میں بکثرت آیات پیش کی جا سکتی ہیں (اور میں' اس سے پہلے' متعدد بار انہیں پیش کر چکا ہوں) لیکن یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
سورہ فاطر میں ہے : **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا** .... (35/27) کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بارش کا نظام کیا ہے اور انواع و اقسام کی فصلوں' پھولوں اور پھلوں کی پیدائش و افزائش کون سے قوانین فطرت کی رو سے ظہور پذیر ہوتی ہے؟ ـــــــ آپ غور کیجئے کہ ان دونوں شعبوں کے تحت کس قدر علوم سائنس آ جاتے ہیں؟۔

اس کے بعد ہے : **وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ** ○ (35/27) اور کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ پہاڑ' جو نظر بظاہر' چٹانوں کے بے ہنگم انبار دکھائی دیتے ہیں' ان کے مختلف رنگوں کے قطعات ـــــ کوئی سفید' کوئی سرخ' کوئی کالا بھجنگ ـــــ کس قسم کے ارتقائی نظام کی شہادت دیتے ہیں ـــــ آپ دیکھئے کہ اس میں کتنے علوم سائنس شامل ہو جاتے ہیں ؟

ازاں بعد فرمایا : **وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ** .... اسی طرح انسانوں' دیگر حیوانوں اور مویشیوں پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ان کی کس قدر اقسام ہیں اور ہر قسم (نوع) کس طرح منفرد خصوصیات کی حامل ہے ـــــ اس کے تحت سائنس کی کس قدر متعدد شاخیں آ جاتی ہیں۔

ان تصریحات کے بعد کہا : **اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ** ○ (35/28) صحیفہ فطرت کے یہ اوراق' یوں تو سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں' لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے

ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رو سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ " علماء " کہلانے کے مستحق ہیں۔

آپ سوچئے کہ ان آیات میں، علماء کا ترجمہ **سائنسٹسٹ** (Scientists) کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ دین میں عالم، سائنس دان ہی کو کہتے تھے۔

لیکن جب دین (اسلام) مذہب میں بدل گیا تو فکر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور علوم سائنس کو کفر اور الحاد قرار دے دیا گیا۔ کائنات کے متعلق جو تصورات اس زمانے میں عام تھے، جب فکر کو منجمد کیا گیا تو وہ حرف آخر قرار پا گئے اور ان کے خلاف سوچنے یا کچھ کہنے کو ارتداد ٹھہرا دیا گیا۔۔۔۔ (مثلاً" مذہب کا ارشاد ہے کہ) سب سے پہلا انسان، مٹی کا ایک پتلا تھا جس کی پسلی چیر کر اس میں سے ایک عورت نکالی گئی اور ان دونوں کے اختلاط سے نسل انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اس پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ آسمان شیشے کا ڈلا ہے جس میں (ستارے) جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ سورج، شام کو خدا کے عرش کے نیچے چھپ جاتا ہے جہاں سے فرشتے اسے، دوسری صبح نکالتے ہیں۔ دوزخ کا منہ باندھا ہوا ہے اور اسے سال میں صرف دو سانس لینے کی اجازت ہے۔ جب وہ سانس باہر کی طرف لیتا ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے، جب اندر کھینچتا ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے۔ زمین چپٹی ہے اور ساکن۔ بنی اسرائیل کے جو اسباط (قبائل) گم ہو گئے تھے، وہ چوہوں کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ (یہ بخاری کی احادیث ہیں) اگر کوئی شخص ان سے انکار کرے تو اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس فکری جمود کا نتیجہ ہے کہ اقوام عالم کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہیں، اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے دست نگر ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ ہم خود علوم سائنس کی تحصیل نہیں کرتے۔ سائنس کی رو سے جو نئی ایجاد دنیا کے سامنے آتی ہے، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس سے مستفید ہونے کو بھی ناجائز قرار دے دیا جاتا ہے۔۔۔۔ ریڈیو کا استعمال ناجائز ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنا بھی گناہ ہے

کیونکہ اس میں چلتی پھرتی انسانی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ٹیلی فون میں شیطان بولتا ہے۔ مردہ کی آنکھوں کو اندھوں کی پیشانی میں پیوند کرنا ناجائز ہے۔ اسی طرح دیگر اعضا کی پیوند سازی (**تقلیم**) بھی ناجائز ہے۔ جب مغربی خلا نورد چاند پر پہنچے ہیں' تو ہمارے مذہبی حلقوں کی طرف سے آوازیں بلند ہوئی تھیں کہ یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔ چاند ایسا ہے ہی نہیں کہ اس پر کسی انسان کا پاؤں ٹک سکے۔ حضورؐ نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ایک ٹکڑا آپؐ کی دائیں بغل کے نیچے سے نکل گیا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بائیں بغل کے نیچے سے۔ **وقس علٰی ھذا** ان " نظریات " کو پیش کرنے والے ہمارے ہاں " علماء کہلاتے ہیں۔

آپ غور فرمایئے کہ دین کے علماء اور مذہب کے علماء میں کس قدر تفاوت ہے ؟

فکر آخرت

اب آیئے " فکر آخرت " کی طرف۔ کار گہ کائنات میں فکری جمود کا نتیجہ تو متاع فطرت سے محرومی اور حرماں **نصیبی** ہے۔ اخروی زندگی سے متعلق امور میں فکر (سوچ) کے شجر ممنوعہ قرار پا جانے سے ہم نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ اخروی زندگی میں غور و فکر کے لئے قرآن کریم نے ایک ایسے نظام معاشرہ کے قیام کو ضروری قرار دیا تھا جس کی عمارت' اقدار و اصول خداوندی پر استوار ہوتی ہے۔ ان اقدار و اصول کی کیفیت یہ ہے کہ

1۔ قوانین فطرت کی طرح' یہ اقدار و اصول بھی فکر انسانی کی تخلیق نہیں۔ خدا کے متعین فرمودہ ہیں۔

2۔ یہ بھی قوانین فطرت کی طرح' غیر متبدل اور ابدی ہیں۔

3۔ قوانین فطرت کو انسانی فکر دریافت کر سکتی ہے لیکن یہ اقدر و اصول وحی کے ذریعے' بوساطت انبیاء کرامؑ انسانوں کو دیئے جاتے تھے۔ اب یہ اپنی آخری' مکمل اور غیر متبدل شکل میں' قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی

غور و فکر ان کی صداقت کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔

4۔ قوانین فطرت اور اقدار وحی کی کار فرمائی کا انداز یکساں ہے۔ قوانین فطرت، محکم اصولوں کی طرح اپنے مقام پر اٹل رہتے ہیں، اور انسانی فکر ان کی روشنی میں نت نئے نظریات وضع کرتی، نئے نئے انکشافات کرتی اور انواع و اقسام کی ایجادات ظہور میں لاتی رہتی ہے۔ اسی طرح، وحی خداوندی کی رو سے جو نظام معاشرہ قائم ہوتا ہے، اس میں یہ اقدار، غیر متبدل حدود کا کام دیتی ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، یہ نظام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، عملی جزئیات مرتب کرتا ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اقدار پر عمل کس طرح کیا جائے۔ جوں جوں زمانے کے تقاضوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی اور انسانی فکر آگے بڑھتی جائے گی، ان کی عملی جزئیات تبدیلیاں ہوتی جائیں گی، البتہ اقدار کی رو سے متعین شدہ حدود اپنی جگہ محکم رہیں گی۔ ان جزئیات کو (اصطلاح میں) احکام شریعت کہا جاتا ہے اور جس فکری طریق سے ان میں حک و اضافہ، اور ترمیم و اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔۔۔ اجتہاد کے معنی ہیں فکری جدو جہد ۔۔۔۔ وہی فکر جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔

فکر منجمد ہو گئی

جب اسلام، دین کی شکل میں قائم تھا تو اس میں اسلامی نظام کا یہی نقشہ تھا۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ اقدار (حدود) کے اندر رہتے ہوئے فکر کی کار فرمائی۔ اس کے بعد جب اسلام، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کی رو سے :۔

1۔ انسانی فکر اس زمانے کی سطح پر پہنچ کر جامد ہو گئی جس زمانے میں دین، مذہب میں تبدیل ہوا تھا۔ اور

2۔ اس کے ساتھ ہی اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور انسانی فکر نے جو احکام

شریعت اس زمانے میں وضع کئے تھے' انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ انہیں فقہی احکام کہا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی' بہ حیثیت مجموعی' عباسیوں کے دور ملوکیت میں رونما ہوئی تھی۔ ان احکام پر ملوکیت کی چھاپ کا لگنا ناگزیر تھا۔

اس وقت سے لے کر اب تک' یہ قوم' دنیاوی (کائناتی) اور اخروی (اقدار خداوندی) دونوں امور سے متعلق' اسی مقام پر کھڑی ہے جہاں اس کی فکر مفلوج اور جامد ہوئی تھی۔ اب اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار یہ ہے کہ جو معتقدات اور نظریات' یا احکام و شعائر' ان معتقدات و احکام کے مطابق ہوں جو اس زمانے میں رائج تھے' انہیں اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو ان سے مختلف ہوں' انہیں غیر اسلامی۔ یعنی اب اسلام' اقدار و اصول خداوندی کی حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام نہیں۔ ان عقائد کا معتقد اور ان احکام کا پیرو ہونے کا نام ہے جو ملوکیت عباسیہ کے زمانے میں وضع ہوئے یا رائج تھے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' اسے فقہی مسلک کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اس نکتہ پر غور کیجئے کہ فقہ (**تفقّہ**) کے معنی غور و فکر کرنا ہیں۔ لیکن اب فقہی احکام انہیں کہا جاتا ہے جن میں غور و فکر حرام ہے۔

شخصیت پرستی

فقہ کے احکام' انسانوں کے مرتب کردہ تھے۔ وہ حضرات (فقہا) کتنے ہی بلند مرتبہ بزرگ اور ماہرین قوانین کیوں نہ ہوں' لیکن تھے تو بالآخر انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے قوانین (کلمات اللہ) کو غیر متبدل قرار دیا ہے۔ (6/116) لہٰذا' انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دینا' انہیں خدائی درجہ دے دینا ہے جو بالبداہت شرک ہے۔ قرآن کی بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس نے شخصیتوں کو ختم کر کے' صرف خدا کی حاکمیت کو باقی رکھا۔

دیکھئے' وہ کس قدر واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (3/79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ..... خواہ اسے مقننہ کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ انتظامیہ کے۔ حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتاب کی محکومیت اختیار کر کے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو' اور جس پر تم غور و خوض کرتے ہو' اللہ والے بن جاؤ۔

انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی (غیر متغیر) قرار دینے میں عملی نقص یہ ہے کہ ہزار سال پہلے کے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وضع کردہ قوانین' اس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں' تو کرتے ہوں' ہزار سال بعد کے زمانے کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر بدلے ہوئے ماحول میں فٹ ہی نہیں بیٹھ سکتے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کا تجربہ تو ہم نت نئے دن کرتے رہتے ہیں۔ مسودہ قانون بڑے غور و فکر کے بعد مرتب ہوتا ہے۔ پارلیمان میں سینکڑوں اراکین کے اجلاس میں وہ موضوع بحث بنتا ہے۔ دو دو تین تین دفعہ اسے دہرایا جاتا ہے۔ اس میں کئی ترامیم کی جاتی ہیں۔ حکومت میں ماہرین قانون کا ایک خاص شعبہ' اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین کرتا ہے۔ اتنی چھلنیوں میں سے چھننے کے بعد' وہ آخری شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن ہنوز وہ پریس میں ہوتا ہے کہ اس کی ترمیم شائع کرنی پڑ جاتی ہے۔ یہ ہے انسانی قانون سازی کی کیفیت۔ ہزار سال پہلے تو قانون سازی کے سلسلہ میں اس قدر اہتمامات کا تصور تک نہیں تھا۔ لہٰذا اس

زمانے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے دینا' عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین تو کر سکتا ہے' عملی زندگی میں ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

ابتداء" فقہی قوانین سے اختلاف قابل اعتراض نہیں تھا۔ علامہ اقبال" کی تحقیق کی رو سے' چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک' قریب انیس مختلف مراکز فقہ وجود میں آ چکے تھے۔ ان میں سے متعدد (حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی وغیرہ) اب بھی باقی ہیں۔ لیکن بعد میں جب' اسلاف کے مسلک کو دین بنا دیا گیا اور فکر پر پہرے بٹھا دیئے گئے' تو ہر فرقہ نے اپنی فقہ کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے' اسے مقدس بنا دیا اور اس سے ذرا سے اختلاف کو خلاف اسلام قرار دے دیا۔

آپ شاید دل میں سوچتے ہوں کہ جب اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ان قوانین کے واضعین بہرحال انسان تھے' تو ان کے وضع کردہ قوانین کو یہ حیثیت دی کیسے گئی؟ یہ نقطہ نظر واقعی اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا محتاج! انہیں یہ حیثیت اس طرح حاصل ہو گئی کہ ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ قوانین ان فقہا کے خود وضع کردہ نہیں بلکہ نبی اکرمؐ کے ارشادات (حدیث) پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ان قوانین سے اختلاف یا ان کا انکار' احادیث یا سنت رسول اللہؐ سے انکار کے مرادف ہے۔ اور یہ کفر ہے۔ ان قوانین کی حضورؐ کی طرف نسبت سے' اب سوال فکر سے متعلق نہ رہا' جذبات سے وابستہ ہو گیا۔ اور جو سوال' جذبات سے وابستہ ہو جائے' اس کی تقدیس' تنقید کی حد سے ماورا ہو جاتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے۔ عزت بخاری کے الفاظ میں :۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید' جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

منکرِ حدیث

نتیجہ اس کا یہ کہ جونہی کسی نے کسی فقہی فیصلہ سے اختلاف کیا' یا اس پر

اعتراض کیا' اس کے متعلق مشہور کر دیا کہ وہ منکر حدیث ہے' منکر سنت رسول اللہ ہے۔ اس سے عوام کے جذبات جس قدر مشتعل ہو سکتے ہیں' ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے فقہی عقائد و احکام کو تنقید کی حد سے بالا تسلیم کرایا جاتا ہے۔

یہ واقعی بڑا نازک مقام ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ ان حضرات کے جذبات کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے' یہ واضح کروں کہ انکار حدیث یا انکار سنت کی حقیقت کیا ہے' اور جسے حدیث یا سنت رسول اللہؐ سے انکار کہا جاتا (یا مشہور کیا جاتا) ہے وہ در حقیقت کس چیز کا انکار ہوتا ہے۔ اس مقام پر میرا مخاطب وہ طبقہ ہے جو سوچ سے کام لینا چاہے' نہ کہ وہ جو جذبات میں بہہ جانا چاہے۔ **وَ مَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔**

میں سب سے پہلے اپنے اس ایمان کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ

میرا ایمان

جو شخص رسول اللہؐ کے کسی ارشاد یا حضورؐ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے' میرے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔

اس لئے کہ حضورؐ کے ارشادات و اعمال حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے " اسوہ حسنہ " قرار دیا ہے۔ اس اسوہ حسنہ سے انکار' نہ صرف انکار رسالت ہے' بلکہ ارشاد خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد' کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے ؟ اسی بنا پر اللہ تعالٰی نے اس اسوہ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ معترضین جسے انکار حدیث یا انکار سنت کہہ کر' کفر و الحاد قرار دیتے ہیں' وہ (در حقیقت) انکار ہوتا کس بات سے ہے ؟ اس کے لئے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ حدیث یا سنت کی صحیح پوزیشن کیا ہے!

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ

1۔ حضور نبی اکرمؐ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔ نہ ہی کسی کے مرتب کردہ مجموعہ پر مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ حضورؐ نے امت کو صرف خدا کی کتاب (قرآن مجید) دی۔

2۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ان ارشادات (احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتب کیا۔

3۔ حضور نبی اکرمؐ کی وفات کے قریب دو سو سال بعد' بعض حضرات نے اپنے طور پر کوشش کی کہ جن باتوں کو لوگ' حضورؐ کے ارشادات کہہ کر بیان کرتے تھے' انہیں اکٹھا کیا جائے۔ اس میں سر فہرست وہ چھ حضرات ہیں جن کے مجموعوں کو سنی حضرات " صحاح ستہ " کہہ کر پکارتے ہیں۔ (شیعہ حضرات کے مجموعے الگ ہیں) (ضمناً) یہ سب جامعین احادیث ایرانی تھے۔ ان میں عرب بھی کوئی نہیں تھا۔ میں' ان میں سے' صرف ایک بزرگ' امام بخاریؒ (متوفی 256ھ) کے نام سے متعین گفتگو کروں گا۔ لیکن جو کچھ ان کے متعلق کہا جائے گا' اس کا اطلاق باقی جامعین احادیث پر از خود ہو جائے گا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جو روایات لوگوں کی زبانی سن کر اکٹھی کیں ان کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جنہوں نے یہ روایات امام بخاریؒ سے بیان کیں' وہ امام صاحبؒ کے زمانے میں موجود تھے۔ لیکن ان کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں قریب دو سو سال کا بعد (فاصلہ) تھا۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے یہ بات خود رسول اللہ سے سنی تھی۔ وہ کیا کہتے تھے؟ وہ یہ کہتے تھے کہ میں یہ نے بات فلاں سے سنی تھی' اور اس نے فلاں سے اور اس طرح متعدد راویوں کا سلسلہ صحابہ کرامؓ یا رسول اللہؐ تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

اگر کسی عدالت میں' ایک گواہ یہ کہے کہ میں نے اس واقعہ کو خود نہیں دیکھا' میں نے یہ بات فلاں سے سنی ہے' تو عدالت اس کی گواہی قبول نہیں

کرتی۔ آپ سوچئے کہ جب ایک گواہ کی سنی سنائی بات کو شہادت تسلیم نہیں کیا جاتا' تو دو سو سال پر پھیلے ہوئے عرصہ کے پانچ سات روایوں کی سنی سنائی باتوں کو شہادت کیسے کہا جا سکے گا؟

پھر' یہ بھی نہیں تھا کہ سب سے پہلے راوی نے رسول اللہؐ کے الفاظ اگلے راوی تک منتقل کر دیئے ہوں۔ اس نے حضورؐ کے ارشاد کا جو مطلب سمجھا اسے آگے منتقل کیا۔ اس طرح ہر راوی نے' سابقہ راوی کے بیان کا جو مطلب سمجھا' اسے آگے بیان کر دیا' اس طرح یہ' مطلب در مطلب مختلف راویوں کی زبانی' امام بخاریؒ تک پہنچا۔

آپ کسی محفل میں بیٹھے ہوئے دس احباب میں سے اپنے قریب ترین دوست کے کان میں کوئی بات کہئے۔ وہ اسے اپنے الفاظ میں اگلے دوست تک پہنچائے اور وہ اگلے تک۔ اس کے بعد وہ بات آپ تک واپس پہنچے تو آپ دیکھئے گا کہ آپ کی بات کیا سے کیا بن کر آپ تک پہنچتی ہے؟ یہ ایک ہی وقت میں' ایک ہی نشست میں مطلب کے تفاوت کی مثال ہے۔ آپ سوچئے کہ جب کسی بات کا مطلب' راویوں کے اپنے الفاظ میں' دو سو سال کے عرصہ میں' جامع روایات تک پہنچے تو اس کی اصل سے کیا نسبت رہ جائے گی۔

اس طرح چھ لاکھ احادیث امام بخاریؒ تک پہنچیں۔ انہوں نے ان میں سے' قریب سات ہزار کو قابل قبول سمجھا اور باقی حدیثوں کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی قریب تین ہزار روایات رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ خود ذات رسالتماب سے تصدیق کر لیتے کہ فلاں روایت فی الحقیت آپ کی ہے! امام بخاریؒ نے اپنے خیال یا اپنی رائے میں جن روایات کو قابل قبول سمجھا' انہیں اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔ جنہیں اپنے خیال میں صحیح نہ سمجھا انہیں مسترد کر دیا۔ ایسے معاملات میں انسان کے خیال یا رائے یا عقیدے کا کس قدر

گہرا اثر ہوتا ہے' اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ امام بخاریؒ کو اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں' امام اعظمؒ (امام بو حنیفہؒ) سے اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظمؒ کو ثقہ قرار نہیں دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے اس لئے امام بخاریؒ کے نزدیک' تمام اہل کوفہ غیر معتبر قرار پا گئے۔ چونکہ کوفہ عراق میں ہے اس لئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سو **حدیثوں** میں ننانویں چھوڑ دو۔ جو ایک لو اسے بھی مشتبہ سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر' دو جلیل القدر ائمہ' یعنی امام ابوزرعہؒ اور امام ابو حاتمؒ نے خود امام بخاریؒ کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے۔ بخاریؒ اور مسلمؒ کے مجموعوں کو شیخین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ' امام بخاریؒ کی ثقاہت پر طعن کرتے ہیں۔

اس کے بعد جامع حدیث کے ذاتی مسلک کی طرف آیئے۔

روایات کا انتخاب

جناب عبدالصمد صارم کا ایک مقالہ' سیرت امام بخاریؒ کے عنوان سے دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ " آستانہ " کی جون 1981ء کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

1۔ امام صاحبؒ کو جو مال ان کے والد سے ترکہ میں ملا' وہ اسے مضاربہ کے طور پر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔ جو منافع ہوتا اس سے بسر اوقات کرتے اور اپنا سارا وقت تحصیل حدیث میں صرف کیا کرتے تھے۔ (صفحہ 32)

مضاربہ کے معنی ہیں (Sleeping Partnership) یعنی سرمایہ لگا کر اس کا منافع لینا۔

2۔ امام صاحبؒ کو غلاموں کی تجارت میں پانچ سو درہم ماہانہ کی آمدنی ہوتی

تھی۔ (صفحہ 33)

ظاہر ہے کہ جب امام صاحبؒ نے حدیثوں کا انتخاب کیا تو ان حدیثوں کو صحیح قرار دیا جن میں مضاربت اور غلاموں کی تجارت کو جائز کہا گیا ہو۔ اور ان دو ایک عقائد پر ہی کیا موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے انہی روایات کو قابل قبول قرار دیا جو ان کے عقائد اور مسلک کے مطابق تھیں۔

سو پہلی بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ (اور اسی طرح ہر جامع احادیث) نے انہی روایات کو صحیح قرار دیا جو ان کی رائے میں قابل قبول تھیں۔

ارباب جرح و تعدیل

اس کے بعد کچھ ارباب فن نے یہ سوچا کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ جن راویوں نے یہ روایات بیان کی ہیں' وہ قابل اعتماد (ثقہ) بھی تھے یا نہیں! یہ خیال تو اچھا تھا لیکن آپ سوچئے کہ ان کے پاس وہ کون سے ذرائع تھے جن کی بنا پر وہ ڈیڑھ' دو سال پہلے کے انسانوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم کر سکتے کہ وہ کیسے تھے؟ ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں انہیں جو (Material) بھی میسر آیا' وہ اسی کی بنا پر' ان راویوں کی ثقاہت یا عدم ثقاہت کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے تھے؟ یہاں معیار پھر ان کی " رائے " قرار پا گئی۔ اس باب میں سید ابو الاعلیٰ مودودی (مرحوم) کہتے ہیں۔

> جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو' وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو۔ اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایہ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو مشکل

ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ 321)

اسماء الرجال

اس کے بعد' بعض ارباب فن نے اس امر کی تحقیق کی کوشش کی کہ راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے' آیا وہ اس کا ہم عصر بھی تھا' یا نہیں۔ ہم عصر تھا تو وہ اس سے ملا بھی تھا یا نہیں۔ ملا تھا تو کیا اس نے یہ خاص حدیث اس سے سنی تھی یا کسی اور سے سن لی تھی۔ ان کی تحقیق کے متعلق بھی مودودی مرحوم نے کہا ہے کہ

اسے **کلیتہ** صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبویؐ اور آثار صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (ایضاً" صفحہ 322)

ارباب جرح و تعدیل اور اسماء الرجال نے' راویوں کی ثقاہت کے متعلق جو رائے قائم کی' اس کی رو سے انہوں نے احادیث کے مختلف درجے مقرر کر دیئے۔ کسی کو صحیح کہا' کسی کو حسن' کسی کو ضعیف وغیرہ۔ ان میں " صحیح " کی اصطلاح بڑی مغالطہ آفریں ہے۔ **سنیوں** کی احادیث کے چھ مجموعوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ یعنی صحیح **حدیثوں** کے چھ مجموعے۔ بخاری اور مسلم کو صحیحین ۔ اور بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ۔ ان کی **حدیثوں** کو صحیح کہنے سے عام طور پر ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقینی طور پر صحیح' یعنی رسول اللہؐ کے مستند ارشادات ہیں۔ لیکن در حقیقت بات یہ نہیں۔ یہ صرف محدثین کی اصطلاح کے طور پر صحیح کہلاتی ہیں۔ یقینی طور پر ان کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فی الحقیقت یہ اقوال رسولؐ اللہ ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث کے آخر میں یہ لکھا ملے گا۔۔۔

اَوْكَما قالَ رَسولُ اللّٰہِ ------ یوں' یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا ہو!

حدیث کا مقام

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ جس طریق سے یہ احادیث جمع اور مرتب ہوئی ہیں اس کی رو سے' کسی ایک حدیث کے متعلق بھی حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ارشاد رسول اللہؐ ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جا سکے گا کہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کردہ قول ہے۔ مودودی مرحوم کے الفاظ میں :۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو' اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا' بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی معتقدین حدیث) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول ماننا ضرو ی ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے ں لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اں۔ 1951ء ایڈیشن ۔صفحہ 29)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

> قول رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں' لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں۔ بخلاف اس کے' روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی (صلعم) کی طرف منسوب کیا گیا ہے' وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (ایضاً" 270)

(ضمناً") میں بھی یہی کہتا ہوں جو مودودی (مرحوم) کہتے ہیں۔ لیکن یہ ستم ظریفی

ملاحظہ ہو کہ مودودی مرحوم کو منکر حدیث نہیں کہا جاتا' اور میرے منکر حدیث ہونے کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جاتا ہے کہ اس کی آواز دور دراز گوشوں تک پہنچتی ہے۔ اور ان ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں خود مودودی (مرحوم) اور ان کی جماعت بھی شامل ہوتی ہے!

بہرحال یہ ہے احادیث کی صحیح پوزیشن۔ لیکن ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ

دوسری طرف

تحقیق و **تثبیت** کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ..... جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ہوں .... ان کا انکار کفر ہو گا اور ملت سے خروج کے مرادف ...... بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے ...... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ از مولانا محمد اسماعیل (مرحوم)
سابق صدر مرکزی جمعیت اہل حدیث۔ صفحہ 45 ز 55)

یعنی بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور ملت کے دائرے سے خارج قرار پاتا ہے۔ (مثلاً) بخاری کی حدیث ہے کہ "جب ملک الموت' حضرت موسیٰؑ کی جان قبض کرنے کے لئے آیا تو انہوں نے اسے ایسا تھپڑ مارا کہ وہ لوٹ کر خدا کے پاس چلا گیا" (کتاب الانبیاء)۔ اگر آپ اس حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کر دیں' تو (مذکورہ بالا فیصلہ کی رو سے) آپ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔

انکار حدیث کے معنی!

اس کے بعد ہمیں اس نقطہ کی طرف آجانا چاہئے کہ انکار حدیث کے معنی کیا ہیں ؟ یعنی جو شخص کسی حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے' وہ کس بات سے

انکار کرتا ہے ؟

آپ چند صفحات پیچھے چلئے جہاں میں نے کہا کہ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے ان تین ہزار حدیثوں کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں شامل کیا جو ان کی رائے میں قابل قبول تھیں۔ اب اگر ایک شخص کہتا ہے کہ' میرے نزدیک فلاں حدیث صحیح نہیں' تو وہ رسول اللہؐ کے کسی ارشاد گرامی کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ میرے نزدیک' امام بخاریؒ کی یہ رائے (یا خیال' یا فیصلہ) کہ یہ حدیث قابل قبول ہے' صحیح نہیں۔ مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے۔ میں اسے قول رسولؐ قرار دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔

لہٰذا' انکار حدیث' رسول اللہ کے قول سے انکار نہیں۔ امام بخاری کی رائے سے اختلاف ہے۔

آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیانتداری سے کہئے کہ اس میں کون سی بات ایسی ہے جس سے کفر لازم آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہیں بھی امام بخاری کی اصابت رائے پر ایمان لانے کا **مکلّف** قرار نہیں دیا۔ یعنی اس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اگر تم یہ مانو گے کہ امام بخاری کی آراء بالکل صحیح اور صائب ہیں' تو تم مسلمان کہلاؤ گے۔ اگر کہو گے کہ مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے تو تم دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ ایسا کہنا خالص شخصیت پرستی ہے اور **کلّیتہً** جذبات پر مبنی ہے۔ کسی انسان کی اصابت رائے پر ایمان لانا' نہ قرآن کا تقاضا ہے' نہ عقل و فکر کا مطالبہ۔

لیکن قوم ہے کہ جذبات کے ان طوفانوں میں بہے چلے جاتی ہے کہ جونہی کسی نے امام بخاری کی رائے سے اختلاف کیا' اسے کافر اور مرتد قرار دے دیا۔ اور یہ طوفان متلاطم کردہ ہیں مذہبی پیشوائیت کے مسلسل پروپیگنڈہ کے!

اس کے بعد ہم اس نکتہ کی طرف آتے ہیں کہ اس غلط عقیدہ کا قوم کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے' اور پڑ رہا ہے - یہ نکتہ بھی گہرے فکر و تدبر کا محتاج ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فقہی احکام کس طرح مرتب ہوئے تھے اور انہیں کس طرح ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا یعنی ان کی بنیاد احادیث پر رکھ دی اور جب احادیث کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا تو فقہی قوانین کی حیثیت خود بخود ایسی ہو گئی۔ اس سے، نہ صرف یہ کہ فقہی احکام (مودودی مرحوم کے الفاظ میں) "منجمد شاستر" بن کر رہ گئے، بلکہ اس سے امت میں اس قدر تفرقہ پیدا ہو گیا جو کسی صورت میں مٹ ہی نہیں سکتا۔

فقہ کے اختلافات

قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی تھی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (4/82)۔ اس کے برعکس احادیث کی یہ حالت ہے کہ مختلف مجموعوں کے باہمی تضادات اور اختلافات تو ایک طرف، اس کے کسی ایک مجموعہ میں باہدگر متضاد احادیث موجود ہوتی ہیں۔ آپ غور فرمایئے کہ جب فقہی احکام کی بنیاد، احادیث قرار پا جائے، اور احادیث میں اس قدر اختلاف ہو، تو فقہی احکام میں کس قدر اختلاف ہو گا؟ امت میں اس قدر فرقے اور ان میں باہمی سر پھٹول سب اسی کا نتیجہ ہے۔ احادیث، مختلف فقہی احکام میں سے ہر ایک کو کس طرح سند مہیا کر دیتی ہیں، اس کی ایک مثال، علامہ محمد اسلم جیرا جپوریؒ نے اپنی کتاب۔ "ہمارے دینی علوم" (صفحہ 163) میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہاء حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہو گی؟ جواب دیا کہ بیع بھی

باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے بھی جا کر یہی سوال کیا؟ انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جا کر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں رایوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں' فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں' مجھے تو حدیث ملی ہے

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھی رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم عن بیع و شرط ۔

یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا انہوں نے کہا کہ **حدثنی ھشام عن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللّٰہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء لانفسھم فقال رسول اللّٰہ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللّٰہ فھو باطل** یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ اولاء ان کی رہے گی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا' انہوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد

کہا کہ **حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیر او شرطت لی حملانه الی لمدینه** ۔ یعنی میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

اس پر' علامہ موصوف نے' اپنے مخصوص انداز میں' چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے' وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں :۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز' فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے احادیث کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

جب تک قرآنی مملکت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم رہی' نہ احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے اور نہ ہی مختلف فقہا کی انفرادی فقہیں مرتب اور رائج ہوئیں۔ یہ سب تباہیاں اس خلافت (مرکز) کے باقی نہ رہنے سے آئیں۔

بہرحال ہم یہ کہہ رہے تھے کہ فقہی احکام کے اختلافی ہونے کی وجہ ان احادیث کا اختلاف ہے جن پر فقہی احکام متفرع ہیں۔ اس باب میں سابقہ ایام میں مختلف فرقوں میں جو مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے تھے' انہیں چھوڑیئے۔ آج کل وفاقی شرعی عدالت مختلف معاملات میں جو فیصلے دیتی ہے انہیں دیکھئے۔ ان میں ساری بحثیں' احادیث کی پوزیشن اور ان کے باہمی (اور قرآن سے) اختلافات کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ حکومت کی قائم کردہ شرعی عدالت ایک فیصلہ دیتی ہے' اور خود حکومت اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دیتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا وہ فیصلہ بھی فقہ اور احادیث پر مبنی ہوتا ہے' اور اس کے خلاف اپیل بھی' فقہ اور احادیث پر مبنی!

اس مقام سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں :۔
ایک ایک' دو دو کر کے کھڑے ہو جائیے' اور پھر سوچئے!

علامہ اقبالؒ کی فکر

ایک .... سوچنے والے ذہن نے اس اہم ترین سوال کے متعلق سوچا تھا' اور اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں اس کا حل بھی بتایا تھا۔ آپ' علامہ اقبالؒ کے " خطبات تشکیل جدید " میں چھٹا خطبہ دیکھئے۔ اس میں اس سوال پر بڑی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کا حل بھی بتایا ہے۔ سب سے اہم سوال قانون سازی کا تھا۔ اس باب میں انہوں نے اپنی بحث کو ان الفاظ میں سمٹا کر پیش کیا کہ

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے قطعاً" یہ نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے ..... قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے' اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں' لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

(ضمناً") علامہ اقبالؒ نے یہ خطبات 1928ء میں دیئے تھے جب ان کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ حال ہی میں میری نظروں سے ان کے ایک مقالہ کا اقتباس گذرا ہے' جو ماہنامہ مخزن کی اکتوبر 1904ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ (یوں کہئے کہ جب وہ) ہنوز طالب العلم تھے۔ اسے دیکھئے اور پھر اندازہ لگایئے کہ ایک سوچنے والا ذہن...

چھوٹی سی عمر میں بھی کس طرح صحیح سمت کی طرف رخ کرتا ہے۔ انہوں نے اس مقالہ میں کہا تھا:-

> حالات زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آ جانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے' ایک نظرثانی کے محتاج ہیں۔ میرا یہ عندیہ نہیں کہ مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے' جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں' بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصولوں کی بنا پر استدلال فقہا نے وقتاً" فوقتاً" کیے ہیں' ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے' مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لئے ایک جدید کلام کی ضرورت ہے' اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و **متخیلہ** کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات مذہب کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب اور منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔
>
> ("قومی زندگی" ' مخزن' اکتوبر 1904ء)

تصورِ پاکستان سے مقصود

فقہ کی اس تشکیل نو کے لئے انہوں نے ' مملکت پاکستان کا تصور دیا۔ اس کا بنیادی مقصد انہوں نے جن مختصر الفاظ میں متعین کیا تھا وہ ارباب فکر و دانش کے لئے دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ " اس سے اسلام کے دامن

سے وہ دھبہ دھو دیا جائے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر لگا رکھا ہے۔ " غور کیجئے کہ انہوں نے اسلام کے ماضی (کی تاریخ) اور مستقبل (کے تصور) کو کس طرح چار لفظوں میں واشگاف کر کے رکھ دیا تھا؟

لیکن اقبالؒ یہ کہہ کر چلا گیا اور اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن !

عربی ملوکیت کا وہ نقش جو پہلے ایک دھبہ کی شکل میں تھا' اب تھیاکریسی کے تصدق' خود اس دامن کا جزو بنایا جا رہا ہے۔ روایات اور فقہ کے وہ اصول و احکام جو مرور زمانہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ خود ہی مٹتے جا رہے تھے' انہیں حیات نو (New Lease of Life) عطا کی جا رہی ہے۔ معلوم نہیں' خدا کی کتاب اور انسانی فکر کو جن نئی زنجیروں میں جکڑا جا رہا ہے وہ امت کے سر پر کب تک مسلط رہیں گی؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تسلط ابدیت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ سوال صرف وقت کا ہوتا ہے۔ لیکن اس دوران میں اسلام جس قدر مسخ ہو چکا ہو گا' اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

سردست تو ہم اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ جب بھی قرآن اور انسانی فکر' ان زنجیروں سے آزاد ہوئے' امت کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہو گا کہ روایات' سیرت' تاریخ' تفاسیر' فقہ کا جائزہ' قرآن کی روشنی میں لے۔ جو اس کے مطابق ہو' اسے قابل قبول سمجھے' جو اس کے خلاف نظر آئے' اسے مسترد کر دے۔ اور پھر امت کے مشورہ سے' قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' احکام و قوانین کی تشکیل جدید کرے۔ اس وقت وہ مملکت بھی اسلامی کہلائے گی اور اس کے قوانین بھی احکام شریعت۔ لیکن' یہ فریضہ' اس انقلابی مرد مومن کے ہاتھوں ادا ہو سکے گا جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) اپنے پیکر میں روح عمریؓ لے کر آگے بڑھے اور پوری جرات و بسالت سے اعلان کرے کہ

حسبنا كتاب الله - ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (چھٹا خطبہ)

قرآنی معاشرہ میں کیا ہو گا ؟

1۔ قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلا تمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہو گی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہو گا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

2۔ کوئی شخص بے کس و لاچار اور بے یارومددگار نہیں ہو گا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

3۔ کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی او ن ی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو گا۔

4۔ معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہو گی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہو گا۔

5۔ ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں۔ یہ نہیں ہو گا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

6۔ ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضا مندی سے حاجتمندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا۔ بلکہ عندالضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا کیونکہ انسانی ذات کی نشو و نما کا یہی طریق ہے۔

7- رزق کے سرچشمے (خواہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہو گی اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

8- ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہو گا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں' لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہو گا) اسلئے اس مین نہ کسی قسم کا جور ہو گا نہ استبدا' نہ ظلم ہو گا نہ زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

9- ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہو گا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد بھروسہ ہو گا اور فریب کی گنجائش نہیں ہو گی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہو گا۔

10- یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو گا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہو گا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً" نافذ ہوں گی۔ تحریک طلوع اسلام پاکستان میں اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوع انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے نظام کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کے لئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرمائیے۔

والسلام

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام - 25- بی گلبرگ 2 لاہور